Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities

(Bi-Annual) Trilingual: Urdu, Arabic and English

ISSN: 2707-1200 (Print) 2707-1219 (Electronic)

Home Page: http://www.arjish.com

Approved by HEC in "Y" Category

Indexed with: IRI (AIOU), Australian Islamic Library, ARI, ISI, SIS, Euro pub.

Published by the Al-Khadim Foundation which is a registered organization under the Societies Registration ACT.XXI of 1860 of Pakistan

Website: www.arjish.com

Copyright Al Khadim Foundation All Rights Reserved © 2020

This work is licensed under a

Creative Commons Attribution 4.0 International License

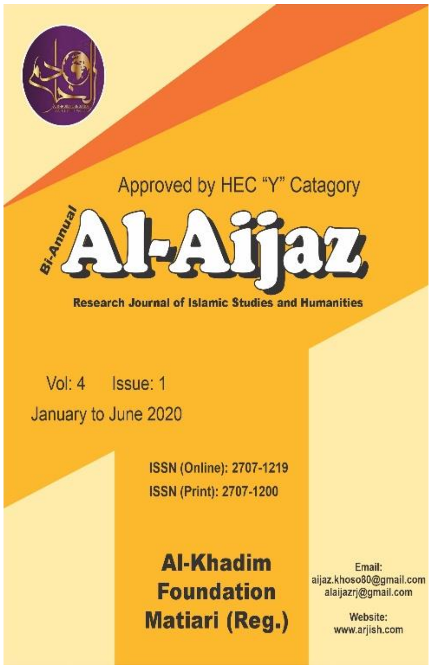

TOPIC:

Religious and Journalistic Services of Pir Ali Mohammad Rashdi

AUTHORS:

1. Muhammad Askari, Research Scholar, Department of Mass Communication, University of Karachi.
2. Tahir Masood, Department of Mass Communication, University of Karachi.

How to cite:

Askari, M., & Masood, T. (2020). U-16 Religious and Journalistic Services of Pir Ali Mohammad Rashdi. Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities, 4(1), 229-246. https://doi.org/10.53575/u16.v4.01.229-246

URL: http://www.arjish.com/index.php/arjish/article/view/102

Vol: 4, No. 1 | January to June 2020 | Page: 229-246

Published online: 2020-06-30

QR Code

پیر علی محمد راشدی کی دینی وصحافتی خدمات

Religious and Journalistic Services of Pir Ali Mohammad Rashdi

Muhammad Askari*
Tahir Masood**

Abstract
Pir Ali Muhammad Rashdi was an eminent Politician, literary figure, writer, journalist and a biographer, born in 15th August 1905 and died on 14th March 1987- He wrote more than one thousand articles in several News Papers like Jang, Wagan, Al-Rashid, Sindh Zamindar etc and he produced more than twenty books like Uhee Denhin Uhee Shenih and Cheen jee (diary), Now I want to critical view on his articles that were published in Daily Jang from 1964 to 1968, and they are selected-
Keywords: Services of Peer Ali Muhammad Rashidi, Journalistic Services of Peer Rashidi, Peer Rashidi Columns in Jang News Paper-

"صحافت" کا لفظ عربی الاصل ہے اس کا معنی کتاب یا رسالہ کے ہیں۔ صاحب معجم الوسیط نے صحافت کی تعریف یوں کی ہے: "یہ ایک ایسا پیشہ ہے جس میں خبروں اور آرا کو جمع کر کے اخبار یا رسائل میں نشر کیا جاتا ہے"۔ اس پیشہ سے وابسطہ آدمی کو اخبار نویس یا صحافی کہا جاتا ہے۔ صحافت کے لیے عموماً انگریزی میں "Journalism" کا لفظ استعمال ہوتا ہے یہ لفظ "Journal" جرنل سے نکلا ہے۔ اردو میں اس کے لغوی معنی ہیں "روزانہ حساب کا کھاتہ اور روزنامچہ" موجودہ دور میں رائج اخبارات، جرائد اور رسائل پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ انسان بنیادی بطور پر باخبر رہنے والا حساس مخلوق ہے۔ تجسس اور جدت اور نئے کی طلب ہمیشہ ازل سے اس میں موجود ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں صحافت انسانی اقدار، حقوق اور احساسات کی ترجمانی کا فریضہ انجام دے رہا ہے گو کہ اس میں بہت سارے قابل اصلاح پہلو موجود ہیں تاہم عوام اور مجبور اور مظلوم لوگوں کی ایک توانا آواز اب بھی صحافتی ہے۔

اسلام نے ہمیشہ تفتیش، جستجو اور تحقیق پر زور دیا ہے۔ کسی بھی بات کو بلا کسی تحقیق کے نہ سننے کی اجازت دی اور نہ آگے پھیلانے کی اور نہ ہی اس پر عمل کرنے کی۔

فرقان حمید میں حق سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: یا ایھا الذین امنو ان جائکم فاسق بنبا۔۔۔۔۔ ترجمہ: اے ایمان والو اگر کوئی فاسق تمہیں کسی بات کی خبر دے تو اس کی چھان بین اور تحقیق کر لیا کریں قبل اس کے کہ تم کسی کو ضرر پہنچاؤ نا سمجھی میں اور بعد میں اپنے کیے پر نادم ہو جاؤ۔" یہ آیات اسلامی صحافت کے لئے بنیادی قانونی حیثیت رکھتا ہے کہ جو بھی خبر دو پوری تحقیق اور ذمہ داری سے دو کیونکہ اس خبر پر تو سماج کا امن، تعلق اور رشتہ استوار ہے۔ اسلام نے صحافی کو بھی ضابطہ اخلاق کا پابند کیا کہ وہ حرص، لالچ، طمع، عداوت، دوستی غرض ہر

* Research Scholar, Department of Mass Communication, University of Karachi.
** Department of Mass Communication, University of Karachi.

تعلق سے ماوراہو کر اپنا فریضہ نبھائے۔ کیونکہ صحافی اصل میں سماجی، ادبی، روحانی، سماجی سیاسی اور تہذیبی، بیداری پیدا کرنے کا ضامن ہوتا ہے۔

سید علی محمد شاہ راشدی 12 جمادی الثانی 5 اگست 1905ء کو بروز جمعہ صبح کو پیدا ہوئے۔ ابھی تین سال کے ہوئے تو ان کے دادا نے انہیں اپنے دواخانے کے منتظم اور گاؤں کے مُلّا کے پاس بھیج کر کہا کہ پہلے دن سے یوسف زلیخا پڑھانا شروع کرے۔ سندھی زبان جو مادری زبان تھی، اسکول میں اس کے لکھنے کو بیجا سمجھا جارہا تھا، اس لیے ساری توجہ پارسی پر دیتا تھا، اسی لیے پیر صاحب نے فارسی سے تعلیم شروع کی، لیکن یہ تعلیم ٹھیک سے نہیں چل پائی، کیونکہ ان کے استاد میاں منٹھل پڑھانے میں زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ انہوں نے انگریزی تعلیم اپنے آبائی آستان بہمن گوٹھ ضلع لاڑکانہ کی نصرت اسٹیشن کے دوہندو اسٹیشن ماسٹر زجیٹھانند اور نارائن سے حاصل کی۔ بمبئی کے کیمبکر اسٹریٹ پیر علی محمد راشدی اپنے دادا کے ساتھ ایک میمن کے پاس مقیم تھے۔ اس گھر کے بالائی حصے میں ایک ریڈنگ روم بھی تھا۔ ایک روز شام کے وقت ریڈنگ روم میں کچھ آدمیوں کے ساتھ ایک سندھی نوجوان بھی بیٹھا ہوا تھا۔ پیر صاحب اور ان کی براہ راست بات چیت ہوئی۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام عمرالدین ہے اور ٹلٹی ضلع دادو کا باسی ہے۔ ایم اے پاس کی ہے اور جامعہ کی جانب سے اسے سونے کا تمغہ بھی ملا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے جیب سے سونے کا تمغہ نکال کر دکھایا اور بتایا کہ وہ میاں عبدالرحیم شاہ سجاول والے کے ساتھ یہاں اس ارادے سے آیا ہے کہ سفارش کرواکے بمبئی سرکار سے اسکالرشپ لیکر بیرون ملک سے ڈاکٹریٹ پاس کر کے آئے۔ سندھی دستور کے مطابق پیر صاحب سے حال دریافت کیا تو پیر صاحب نے بتایا کہ وہ فارسی پڑھ رہے ہیں، مسجد کے مولوی سبق دیتے ہیں۔ اسکول جانے کا سوال ہی نہیں ہے۔ زمین بھی ہے، ملازمت نہیں کرنی جو اسکولی تعلیم لوں۔ پیر صاحب کا یہ قصہ سن کر نوجوان تعجب میں پڑ گیا اور کہا کہ تم ذہین لڑکے ہو، تمہیں باقاعدگی کے ساتھ سندھی وانگریزی تعلیم اسکول میں جا کر لینی چاہئے۔ وہ وقت آرہا ہے جب علم کے بغیر دوسری کوئی بھی چیز کم نہیں آنی۔[1]

پیر صاحب نے جواباً کہا کہ میرے دادا بھی یہاں آئے ہوئے ہیں، موقع دیکھ کر آپ ان سے بات کر کے دیکھیں۔ رات کو پیر صاحب نے اپنے دادا کو بتایا کہ ایک غریب سندھی نوجوان اس محلے میں ٹھہرا ہوا ہے، اسے اسکالرشپ چاہئے۔ آپ ان سے ملاقات کریں اور اسکالرشپ والے کام میں اس کی مدد کریں۔ ان کے دادا کی علی محمد خان دہلوی مرحوم سے پرانی دوستی تھی، جو اس وقت بمبئی سرکار میں وزیر تھا۔ دوسرے روز عمرالدین مرحوم کو لیکر پیر صاحب نے اپنے دادا سے ملوایا اور اپنے دادا سے یہ وعدہ لیا کہ اس کو کرنل براؤن کے کیمبرج اسکول میں انگریزی تعلیم کے لیے ضرور بھیجیں گے۔ سندھ واپس آنے کے بعد مرحوم عمرالدین پیر صاحب کی تعلیم کی بذریعہ خط وکتاب کرتا رہا اور جب پیر صاحب دیرادون جانے لگے تو وہاں کے پرنسپال کرنل براؤن کے نام تعارفی خط بھی بھیجا، حالانکہ کرنل براؤن سے ان کی کوئی بھی ذاتی واقفیت نہ تھی۔ دیرادون اسکول میں صرف ایک دن پیر صاحب نے تعلیم لی۔

دوسرے روز صبح سامان لیکر واپس گھر پہنچا۔ پیر صاحب کا خاندانی پیشہ زمینداری تھا۔ وہ پیر بھی تھے اور وڈیرے بھی۔ ہر طرف وڈیرا راج تھا۔ دیہاتی زندگی میں ہر طرف جہالت، سستی وکاہلی، ظلم وستم، چوری چکاری، تنازعات، بڑے وڈیرے اور جاگیردار عیش وعشرت اور

فضول باتوں میں اپنا وقت ضایع کیا کرتے تھے۔ مرغے لڑاتے تھے، سوئر اور کتے کی لڑائی دیکھتے تھے۔ خود سے برتر کی خوشامد اور خود سے کمزور کے اوپر ستم ڈھاتے تھے۔ پیر صاحب کا ایسے ماحول سے، اس طرح کے لوگوں سے کوئی بھی ذہنی وابستگی نہیں تھی۔ یہ ذہنی انقلاب لانے میں ان کے والدہ بی بی صاحبہ کا بڑا عمل دخل تھا۔ وہ ہر وقت انہیں سمجھاتی تھیں کہ زمانہ بدل رہاہے، وڈیرے اور پیر کا راج اب نہیں چلنے والا۔ اگر علم حاصل کروگے، محنت کروگے تو اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکوگے اور کچھ کرسکوگے ورنہ دھکے کھاتے رہوگے۔[2]

سندھ کے یہ ادب، سیاستدان و صحافی مورخہ 14 مارچ 1987ء کو اس فانی جہان سے انتقال کرگئے۔ ان کے جسد خاکی کو کراچی کے میوہ قبرستان میں دفنایا گیا۔

پیر علی محمد راشدی کی تصنیفی خدمات:

پیر علی محمد راشدی صاحب نے تاریخ، سیاست، صحافت اور معاشرے کی اصلاح کیلئے جو کتابیں لکھیں وہ درج ذیل ہیں۔

سنڌ جا سُور(Suffering of Sindh):

یہ کتاب سندھ کی بمبئی سے علحدگی کی تحریک کا ایک تاریخی دستاویز ہے، جو تحریک کے نمایاں رہنما محمد ایوب کے نام سے شایع ہوا تھا (پیر صاحب ان کے سیکریٹری تھے) البتہ اس کے سندھی ترجمے پر مترجم کے طور پر پیر صاحب کا نام درج ہے۔ یہ کتاب 1930ء کو شائع ہوئی۔

حیات معصوم:

پیر صاحب کے سکھر میں قیام کے دنوں میں میر معصوم بکھری کی شخصیت کو سمجھنے کے سلسلے میں یہ کتاب لکھی گئی، جو 1932ء کو شایع ہوئی۔

1937ء میں سندھ اسمبلی نے جب اللہ بخش سومرو کی وزارت وجود میں آئی، تب سر غلام حسین نے روایتی اقتدار پرستوں والا رویہ اختیار کرتے ہوئے اپنی جماعت مسلم لیگ کو خیرباد کرکے پانسہ بدل کر وزارت حاصل کی۔ تب اپنی صفائی میں 'اصلاح' اخبار کی 16 فروری 1939ء کے پرچے میں ایک بیان جاری کرکے اپنی جماعت مسلم لیگ اور اس کے رہنماؤں پر تنقید کی۔ اس جواب میں اصل حقائق بیان کرنے اور سندھ کے لوگوں کی سیاست معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے یہ کتاب تحریر کی گئی، کیونکہ پیر صاحب کا خیال تھا کہ سندھی قوم میں یہ لیاقت پیدا کی جائے کہ وہ سیاسی مسائل کو حقائق کی روشنی میں خود سمجھ سکیں۔ یہ کتاب 1939ء کو شایع ہوئی۔

4۔ فریاد سندھ:

پیر صاحب کی یہ کتاب 'قربانی' اخبار میں شایع کردہ ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے آزادی سے قبل مسلم لیگ کی جانب سے نیا ملک بنانے والے مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے سندھ پر نازل ہونے والی آفات سے آگہی کے طور پر تحریر کیے گئے تھے۔ اس وقت مسلم لیگ کے نام پر اس قدر خوف پھیلایا گیا تھا کہ جب یہ کتاب شایع ہوئی تو اس میں اس کے مصنف کا نام بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔ کافی عرصے تک یہ بات صیغہ راز میں رہی۔ 1969ء کو سائیں جی۔ ایم سید نے اپنی کتاب ''جنب گذاريم جن سين'' میں اس کا اظہار کیا کہ مشہور کتاب فریاد سندھ پہلے مضامین کی شکل میں ''قربانی'' میں شائع ہوئی، بعد اسے کتابی صورت دیکر سندھ میں تقسیم کیا گیا۔

5۔موجودہ سیاسی صورتحال:

پیر صاحب کی یہ کتاب بھی قربانی اخبار کی ضرورت اور اس وقت کی سیاسی ضروریات کی روشنی میں اخبار کے لیے لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں پیر صاحب نے مسلم لیگ، سیاسی، پاکستان اسکیم اور سندھ کے مستقبل کے حوالے سے دور اندیشی سے بھر پیشنگوئیاں کی ہیں۔ 1940ء کی قرار اور بعد میں کی گئی ردعمل پر یہ کتاب 1946ء کو شایع ہوئی۔

6۔ سنڌ جي تحريڪ جو اڳواڻ جي- ايم-سيد:

یہ کتاب مسلم لیگ سے تصادم کے دور میں 1946ء کو پہلے مضامین کی صورت میں قربانی اخبار میں شایع ہوئی، جس کو بعد میں کتابی صورت میں لایا گیا۔اس کتاب اور جی۔ایم سید کے نظریات و عملی جدوجہد کا اس دور میں آئیندہ دور کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے۔

7۔روينيو ۽ هيلٿ کاتي جي ڪارگذاري:

1953ء میں پیر صاحب محکمہ ریونیو اور ہیلتھ کی وزارت کے دوران جو عوامی کام کیے، انہیں عوام کے سامنے لانے اور ریکارڈ پر رکھنے کے لیے یہ کتاب شایع کروائی۔

8۔جاگيرداري جو خاتمو:

پیر صاحب نے اپنے دور وزارت میں سندھ میں جاگیرداری کے خاتمے کے لیے اہم فیصلے کروائے۔مذکورہ بالا کتاب اس عرصے میں شایع ہوئی اور جاگیرداری کے بارے میں معلومات مہیا کرتی ہے۔

9۔ اهي ڏينهن اهي شينهن جلد پهريون:

پیر علی محمد صاحب نے اس کتاب میں خیرپور، سکھر، شکارپور، جیکب آباد اور لاڑکانہ کے مشاہیر اور اس دور کی سماجی وسیاسی صورت حال پر اپنے خیالات کا اظہار نہایت عالمانہ انداز میں کیا ہے۔اس کتاب کی دوسری تمام معلومات ایک طرف اور اس کی ابتداء میں ''سرداری زندگی کی تصویر'' کے زیر عنوان چالیس صفحات پر مشتمل اس دور کی سیاسی و سماجی حالات اور انسانی رویوں کا گہرائی سے کیا گیا مشاہدہ ہے۔دوسری جانب ان کی کلاسیکل نوعیت کی یہ تفصیل ہی اس دور کی شخصیات کے کردار کو سمجھنے کے سلسلے میں بہتر رہنمائی کرتی ہے۔ان کی یہ کتاب 1966ء کو شایع ہوئی۔

10۔سوشلزم،اس کے محرکات ومضمرات:

1970ء کے انتخابات کے دوران جس طرح سوشلزم اور نام نہاد اسلامی سوشلزم کی پرچار کی جاری رہی تھی،اس وقت پیر صاحب نے مندرجہ بالا موضوع پر یہ کتاب تصنیف کی۔ جس میں انہوں نے تاریخ کی روشنی میں سوشلزم کے نام پر جاری برائیوں کے بارے میں تحریر کیا۔

11۔خط ومضمون:

پیر صاحب کے جی ایم سید کے نام 1932ء سے 1958ء تک کے بھیجے گئے خطوط کا مجموعہ ہے، جس میں اس دور کی سیاسی تاریخ کے کئی اتار

چڑھاؤ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ مسودہ جی ایم سید نے مرتب کر کے عالمانہ پیش لفظ کے ساتھ 1970ء کو شایع کیا۔

12۔سنڌ پنجاب جي لاڳاپن جو جائزو:

پیر صاحب نے یہ کتاب 1975ء کو اس وقت تحریر کی، جب وہ وزیر اعظم کے مشیر خاص تھے۔ انگریزی میں لکھی گئی یہ کتاب تحریک نظریہ پاکستان کی جانب سے شایع ہوا، جس میں بعد میں 1987ء میں صحافی ظہیر احمد نے اپنی کتاب **"سندھ میں قوم پرستی، نئے اور پرانے رجحانات"** اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب نے فریاد سندھ کے برعکس پنجاب کی طرف ہمدردانہ رویہ رکھتے ہوئے سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کی تحریک سے لیکر پنجاب کی کچھ سیاسی شخصیات اور کچھ اخبارات کی جانب سے اختیار کیے گئے مثبت رویے کو بنیاد بنا کر پنجاب کی مدد کرنے اور احسانات کے گن گائے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اس معاملے میں ون یونٹ کی سازش کی بھی شاندار وکالت کرتے ہوئے اور پنجاب کو بے قصور قرار دیتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سندھ اسمبلی سے صرف چار وزراء مخالفت کر رہے تھے۔

13۔اهي ڏينهن اهي شينهن(جلد پهريون)

پیر صاحب نے اس حصے میں مشرق کے ملک، سندھ کی مارو ی کے زیر عنوان دادو جاد واور ضلع کراچی سے وابستہ شخصیات کے بارے میں مواد دیا ہے، لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ سائیں جی ایم سید جن کا دونوں اضلاع کی سماجی، تعلیمی و سیاسی امور میں بڑا دخل تھا، کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ "اُهي ڏينهن اُهي شينهن" کی پہلی جلد لکھتے وقت پیر صاحب کے ذہن میں یہ کتاب کو حصوں میں لکھنے کا تصور نہیں تھا، اس لیے کتاب کی پہلی اشاعت میں بھی اس طرف اشارہ نہیں کیا گیا، لیکن بعد میں جب پیر صاحب نے مزید لکھنا شروع کیا اور 1980ء میں کتاب کا دوسرا حصہ شایع ہوا تو ان کے ذہن میں یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ کتاب 3 حصوں میں شایع ہو گی، تاکہ اپنے دور کی تمام اہم شخصیات کے بارے میں خیالات کا اظہار ہو سکے۔ اس کے باوجود سائیں جی ایم سید سمیت کئی شخصیات کا اس حصے میں ذکر نہیں ہے۔

14۔اهي ڏينهن اهي شينهن (جلد ٽيون):

کتاب کے اس حصے کو کسی ایک ضلع یا ڈویژن تک محدود نہیں رکھا گیا، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ پچھلے دو حصوں میں جن شخصیات کا تذکرہ رہ گیا تھا، ان کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ سائیں جی ایم سید کا ذکر پھر بھی نہ ہوا۔ جیسا کہ سید کی شخصیت گویا ان کے سلسلے کے قابل ہی نہ تھی، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ بات راشدی صاحب بھی سمجھ رہے تھے۔ راشدی صاحب کے مشہور ہے کہ وہ واقعات میں رنگینی پیدا کرنے کے لیے مرچ مسالہ ملاتے تھے، اس لیے کسی بھی کردار کے بارے میں ان کی زندگی میں نہیں لکھا۔ اس کتاب کے حوالے سے کئی مثالیں مشہور ہیں، لیکن سب سے بڑی مثال سائیں جی ایم سید کی شخصیت کی ہے، جو 1920ء سے 1935ء تک سندھ کی سیاسی، سماجی زندگی پر چھائے رہے، لیکن 1981ء کو مکمل کیے کردہ اس کتاب میں ان کا جداگانہ ذکر نہیں ہے۔ پیر صاحب اعلیٰ درجے کے ذہین انسان تھے، باتیں بنانا تو کوئی ان سے سیکھے۔ کتاب کا دوسرا حصہ شایع ہوا، جس میں دادو اور کراچی کے لیے مشاہیر تحریر ہیں، تب انہوں نے کہا تھا کہ

سید صاحب اصل کام دادو نہیں بلکہ کراچی میں ہے اور کراچی میں قصہ ابھی مکمل نہیں ہوا، اس لیے آئندہ حصے میں سید صاحب کا تفصیلی احوال دیا جائے گا۔ بالآخر دوسرا حصہ بھی شایع ہوا، لیکن وہ احوال شامل اشاعت نہیں تھا۔ تب پیر صاحب سائیں جی ایم سید کے پاس ایک خصوصی اسکیم لے کر پہنچ گئے۔ سید صاحب سے ان کے شایع شدہ کتابوں کی تقاضہ کرتے ہوئے بولے، ''آپکی شخصیت عالمی سطح کی ہے،

15۔ روئداد چمن:

پیر صاحب 1982ء میں روزنامہ جنگ میں ''پرانی اور بھولی ہوئی باتیں'' کے زیر عنوان کالم لکھتے تھے۔ مارچ 1986ء میں ان میں سے منتخب کالمز کا مجموعہ ''روئداد چمن'' کے عنوان سے شایع ہوا، جو ان کے الفاظ میں تصریحات و توصیحات تاریخ پاکستان کا بنیادی ماخذ ہے، جس میں انہوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں پاکستان میں وقت بہ وقت حقائق سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب ملک کی جدید تاریخ کا گمشدہ بنیادی باب ہے۔

16۔ رندءِ پنڈ:

پیر صاحب بنیادی طور پر سیاسی ورکر تھے، جنہوں نے شروع سے مضمون و کالم لکھ کر اپنی سیاسی و سماجی خیالات کی پرچار کے لیے قلم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ یہ کتاب بھی ان کے اسی طرح کے خیالات کا مجموعہ ہے، جس میں ان کے وہ تاریخی، ادبی، سیاسی و سماجی کالمز اکٹھے کیے گئے ہیں، جو انہوں نے 1968ء-1969ء کے دور میں روزنامہ عبرت حیدرآباد میں مندرجہ بالا عنوان سے لکھے تھے۔

17۔ مولانا غلام رسول مہر اور پاکستان اسکیم:

مولانا غلام رسول مہر اور راشدی برادران کے علمی تعلقات کا ہر قاری کو بخوبی علم ہے، لیکن اس بات کا کم لوگوں کو اندازہ ہوگا کہ وہ دونوں آپس میں رفیق کار بھی رہے۔ بالخصوص سیاسی دستاویزات کی تیاری کے معاملے پر ان کا باہمی تعاون تھا۔ پیر علی محمد راشدی کی مذکورہ کتاب ان کے اس تعاون کی نشاندہی کرتی ہے۔ پیر علی محمد صاحب اور مولانا غلام رسول مہر کے تعلقات کی شروعات 1938ء سے ہوئی جب مولانا مہر 1938ء کو کراچی کانفرنس سے کچھ روز قبل حاجی عبداللہ ہارون کی دعوت پر کراچی آئے تھے، تاکہ اجلاس کے کام کاج اور قرارداد کے سلسلے میں مشورہ کیا جا سکے۔ پیر علی محمد راشدی بھی اس وقت حاجی عبداللہ ہارون کے دست راست تھے۔ کانفرنس کے بعد جلد ہی علی محمد راشدی لاہور گئے، تاکہ کراچی اجلاس کے دوران پاس کی گئی قراردادوں کی روشنی میں ملکر آل انڈیا سطح پر پرچار کیا جا سکے۔ دراصل ایسی کوششوں کے نتیجے میں ہی 1940ء کی قرارداد لاہور پاس ہو سکی۔

1938ء کی کانفرنس کے وقت حاجی عبداللہ ہارون کی فرمائش پر مسلم لیگ کے نقطہ نظر سے ہندستان میں مسلمانوں کے موقف کی پرچار کے لیے مولانا مہر نے ایک کتاب لکھی تھی، جو 1939ء میں سیاسیات، اسلامیات ہند کے نام سے لاہور میں شایع ہوئی۔ حاجی عبداللہ ہارون نے اس کتاب کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرکے شائع کروانے کا کام علی محمد راشدی کے حوالے کیا۔ یہ تھی پیر علی محمد راشدی اور مولانا غلام رسول کی پہلی سیاسی وابستگی، جو بعد میں 1946ء تک برقرار رہی۔ اس کے بعد علمی امور پر وابستگی تو آخر وقت تک برقرار رہی۔ تاریخ سندھ

کلہوڑا دور حکومت کا دو ضخیم حصوں میں مولانا سے لکھوانا راشدی برادران کے ذاتی تعلقات کا ہی نتیجہ تھا۔ ان پرانے اپنائیت بھرے مراسم کی روشنی میں پیر علی محمد شاہ نے مولانا سے اپنی واقفیت، تعلقات و دوستانہ مراسم کی یادوں قلمبند کیا۔ ان موضوعات کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے خود تحریک پاکستان کے حوالے کئی دوسری اہم باتوں کا بھی ذکر کر گئے۔ یہ کتاب نظریاتی امور و معلومات کا ایک ایسا مجموعہ بن گئی جو دلچسپ بھی تھی اور فکر انگیز و معلوماتی بھی تھا۔ مولانا مرحوم کی زندگی، ان کی خصوصیات، ذہن، فکر و سیرت کے کچھ گوشے نمایاں ہوئے، جو راشدی مرحوم ہی کر سکتے تھے۔ دیگر کا جیسا کہ مولانے کے ساتھ ایسا تعلق ہی نہ تھا، اس لیے ایسی تحریریں کسی دوسرے کے بس کی بات نہ تھی۔ اس بات کے مد نظر ابو سلمان شاہ جہانپوری نے پیر علی محمد راشدی کی ان مضامین کو یکجا کر کے، موضوع وار بابوں میں تقسیم کر کے کتابی صورت میں مجلس یادگار مہر کراچی کی جانب سے 1992ء کو شایع کروایا۔

18۔ون یونٹ کی کہانی:

پیر صاحب کے لیے مشہور ہے کہ ون یونٹ کے سلسلے میں ان کا بنیادی کردار تھا۔ اس حوالے سے ان پر مختلف گروہوں کی جانب سے فرد جرم عائد ہوتا رہتا تھا۔ شاید ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں گزرے دور میں کالمز کی صورت میں ون یونٹ کی تاریخ لکھی، جس میں انہوں نے حسب معمول اپنے مفاد والا مخصوص انداز اختیار کیا ہی تھا، لیکن اس سے یہ بھی فائدہ ہوا کہ ون یونٹ کے حق میں اپنائے گئے رویے کے بارے میں معلومات ملی تھی، جو آئیندہ ادوار کے رخین کے لیے ون یونٹ کی صحیح تاریخ لکھنے میں مددگار ثابت ہو گی۔ ان کی یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور نے 1993ء کو شایع کی۔

19۔چين جي ڊائري:

پیر صاحب 1962ء سے 1963ء تک دس ماہ کے لیے چین میں پاکستان کے سفیر تھے۔ ان کی اس وقت کی ڈائری مذکورہ بالا نام سے 1995ء میں انسٹیٹیوٹ آف سندھالاجی کی جانب سے شایع کی گئی۔

اس کتاب کے پڑھنے سے پیر صاحب کی اعلیٰ پایہ کی سفار تکاری کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔

20۔ سکر بکر روھڙي تاريخي مطالعو:

یہ کتاب پیر صاحب کی ان اوائلی تحقیقی مضامین پر مبنی ہے، جو انہوں نے سندھ ہور سالے اور ستارہ سندھ میں تحریر کیے تھے، جن کا موضوع سکھر بھکر کے مشاہر، مغلوں کے آثار اور سکھر میں جاری جنگیں ہیں۔ ان بکھرے ہوئے مسودے کو ڈاکٹر نواز علی شوق نے ترتیب دے کر سکھر ہسٹاریکل سوسائٹی کی جانب سے 2001ء کو شایع کروایا۔

Sindh Rays and Days ـ21

اس کتاب میں پیر صاحب نے اپنی شکاری دنیا میں مختلف ادوار میں کیے گئے تجربات و یادوں کو قلمبند کیا ہے، جس میں سندھ سے زیادہ بلوچستان، دہلی، کشمیر میں کیے گئے شکاروں اور شکاری کچہریوں کے بارے میں مواد شامل ہے۔ یہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے

2003ء کو شایع کیا۔

پیر علی محمد راشدی کی اخبار نویسی میں خدمات

بیسویں صدی کے دوسری دہائی میں، ہمارے راشدی بھائیوں نے صحافت کا باقاعدہ آغاز کیا، "ان دنوں میں ایک اخبار شایع کرنا قانونی طرح سے آسان عمل تھا، کسی مجسٹریٹ کے سامنے صرف ایک وضاحت کرنی ہوتی تھی کہ میں فلاں جگہ سے فلاں اخبار نکالنا چاہتا ہوں۔ مجسٹریٹ اس کی تصدیق کرتا تھا اور اس کے مطابق پوسٹ پوسٹ آفس سے رعایت مل جاتی تھی۔ اجازت کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ برطانوی پالیسی یہ تھی کہ جتنا ممکن ہو وہ لوگوں کو آزادی اور سہولت حاصل ہو۔[3]

اس وقت صحافی حضرات صحافت کو ایک مقدس پیشے کے طور پر اپناتے تھے۔ لوگ ان کی ایمانداری اور کردار کے بارے میں اتنے سنجیدہ ہوتے تھے، اگر انہیں اس بات کا شک ہو کہ فلاں اخبار نویس صرف پیسے کمانے کے لئے اخبار شایع کرتا ہے، اور عوامی فلاح کے نام پر کوئی چال چل رہا ہے تو اس کا اخبار خریدنا تو دور کی بات ہے لوگ موقع ملتے ہی اس کے ساتھ دوہاتھ کرنے سے نہ گھبراتے تھے۔ یہ جائز سمجھا جاتا تھا کہ اخبار نویس ہنستے مسکراتے اپنی اخبار کو سرکاری آرگن کرکے حکومتی ترجمانی اور خوشامد کرتے رہیں لیکن بات سیدھی اور واضح ہو۔ منافقت نہ ہو۔[4] اس طرح صحافت کے ماحول میں ہمارے راشدی صاحب نے بھی قدم رکھا۔ اخبار نویسی کی تربیت مولانا عبدالکریم چشتی سے حاصل کی اور اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بہت تجربہ حاصل کیا۔ راشدی صاحب کے صحافتی خدمات جائزہ درج ذیل ہے:

الراشد :

پیر علی محمد راشدی نے 1924ء اپنے گاوں بہمن سے الراشد نامی اخبار نکالا۔ اس اخبار میں عملا کام پیر حسام الدین کا ہوتا تھا، علی محمد راشدی صرف ادارت دیکھتے تھے باقی جو بھی کام ہوتا تھا وہ حسام الدین شاہ راشدی کیا کرتے تھے، یہ ان کا پہلا تجربہ تھا اس وجہ سے زیادہ دیر پاثابت نہ ہو سکا۔ اس میں راشدی صاحب کا کام خریداروں کی فہرست ترتیب دینا، ایڈریس کی سلپیں بنانا اور ڈاک ٹکٹ لگانا، بنڈل پوسٹ آفس لے جانا، آمدنی اور اخراجات کا حساب رکھنا، یہ سب کام ان کے ذمے تھے اور وہ بہت سلیقے سے یہ فائض پورے کرتے تھے۔[5] یہ ماہوار رسالہ سب سے پہلے 'سندھ زمیندار پریس' سکھر اور پھر 'الحنیف پریس' سکھر سے شائع ہوتا تھا۔

جاگن:

سائیں جی ایم سید لکھتے ہیں کہ: "1926ء میں، یہ اخبار نواب خالقداد بھیونے جاگن (شکارپور) سے شروع کیا۔ پیر علی محمد راشدی نے اس اخبار کا نامہ نگار بن کے کام کیا کرتے تھے۔"[6]

لیکن ڈاکٹر انور فگار نے اپنی ایک کتاب "شکارپور کی صحافتی تاریخ" میں اس اخبار کے بجائے نواب صاحب کے پندرہ روزہ اخبار ''تنظیم'' کا ذکر کیا ہے۔[7]

المنار:

راشدی صاحب، عبدالرحیم کھرل اور حافظ عبدالحمید بھٹی (رشید بھٹی کے والد) کے ساتھ یہ ماہوار رسالہ 1929ء میں سکھر سے جاری کیا۔ آگے چل کے اس میگزین کو ایک ہفتہ وار اخبار کی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس میگزین کو حافظ حنیف بھٹی اپنی پرنٹنگ پریس شمسیہ کتب خانے سکھر سے شائع کرتے تھے۔ راشدی صاحب اس میگزین میں مدیر کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس میگزین میں ان کے اداریے شاندار ہوتے تھے۔[8] راشدی صاحب نے، اپنے افسانے اور ناول بھی اسی اخبار میں شائع کیے تھے، پھر کتابچوں کی صورت میں، حفیظ عبدالحفیظ بھٹی مرحوم نے اپنی پریس سے شائع کیے۔ جن کی تفصیل آگے آئیگی۔

پیغام:

یہ ہفتہ وار رسالہ مولانا عبدالکریم چشتی مرحوم نے شکارپور سے، 17 اگست، 1929 میں جاری کیا۔[9] راشدی صاحب بھی 1930 میں اس رسالے کے نمائندہ مقرر ہوئے۔ یہ رسالہ چھ سال تک جاری رہنے کے بعد 1935ء میں بند ہو گیا۔[10]

سندھ زمیندار:

یہ اخبار شیخ محمد قادر اور دوسرے زمین داروں کی کوششوں کے ساتھ جاری ہوا، زمیندار اور عام مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرتا رہا۔ اس اخبار کا پہلا ایڈیٹر ماسٹر عبدالوہاب تھا، اس کے بعد ماسٹر احمد علی علیگ آئے۔[11] اس وقت یہ اخبار دیگر روایتی اخباروں کی طرح جاری تھا۔ بعد میں جب یہ اخبار خانبھادر محمد ایوب کھوڑو کے انتظام میں آیا، تو اس نے اپنے سیکرٹری پیر علی محمد راشدی کو مئی 1929 میں اس اخبار کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ کھوڑو صاحب نے 1930ء میں پیر علی محمد راشدی کی دیگر مصروفیات کو دیکھتے ہوئے ان کے چھوٹے بھائی راشدی صاحب کو اس اخبار کا ایڈیٹر مقرر کیا، جس نے۔ اس حوالے سے، راشدیؒ صاحب اپنی یاداشت میں لکھتے ہیں کہ:" اس (کھوڑو صاحب) نے ایک بار سکھر جاتے ہوئے مجھے نصرت سٹیشن پر ملنے کے لئے کہا، جہاں میں ان سے ملا تو انہوں نے ڈاک لفافے کے کاغذ کے ٹکڑے پر مینیجر کی طرف لکھ کر دیا۔ حسام الدین کو تیس روپیہ ماہانہ تنخواہ کے ساتھ سندھ ذمیدار کا ایڈیٹر مقرر کیا جائے۔"[12]

پیر علی محمد راشدی، سید حسام الدین راشدی، اور خانبہادر کھوڑو صاحب کے زمانے ہیں اخبار سندھ زمیندار نے گلے سے حکومتی سرپرستی کا طوق نکال کر، خالص قوم پرستی کا راستہ اختیار کرنا شروع کیا اور اخبار نے بہت شہرت پائی۔ پیر علی محمد راشدی "راشدی" صاحب کے دور سے متعلق لکھتے ہیں:" وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ ایک اداریہ لکھ سکے۔ لکھائی میں تیزی ہوتی تھی اور لفاظی سے زیادہ دلائل پر زور تھا۔ اس نے مختصر وقت ہیں شہرت پائی اور مجھے تسلی ہوئی کہ میری مصروفیات اور عدم موجودگی کی وجہ سے اخبار کے معیار میں کوئی فرق نہیں آئے گا، میری توقع سچ ثابت ہوئی۔"[13]

1934 میں پیر علی محمد راشدی اور خانبھادر محمد ایوب صاحب، کے درمیان میں کچھ سیاسی اختلافات پڑ گئے، اس وجہ سے دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔ پیر صاحب نے سیکرٹری شپ کا استعفےٰ خانبھادر کو بھیجا تو راشدی صاحب نے بھی اپنے بھائی کی پیروی کرتے ہوئے اخبار کو الوداع

کیا۔اس کے بعد، دونوں راشدی بھائی اپنے گاؤں بھمن میں رہنے لگے اور سکھر چھوڑ دیا۔

ستارہ سندھ:

1934ء میں ہی دونوں راشدی برادران گاؤں چھوڑ کر ایک بار پھر سکھر گئے، انہوں نے نئی اخبار شروع کی، اقتصادی وسائل کی کمی کے باوجود 'ستارہ سندھ' کی ڈکلیئریشن لے کر، اخبار جای کیا۔اخبار کے چیف ایڈیٹر پیر علی محمد راشدی بنے، جبکہ راشدی صاحب نے ایڈیٹر کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ راشدی صاحب کی ادارت کے متعلق ان کے بڑے بھائی پیر علی محمد راشدی نے کہا کہ: **"حسام الدين ڪوشش وٺي پهرئين پرچي ۾ هر قسم جي موضوع تي تمام دلچسپ مواد ڪٺو ڪري ڏنو- ادب ۽ تاريخ کانسواءِ سياسي اهميت جون شيون بہ ڏنيون، مرحوم ۾ ٿوري جذباتيت هئي، ڪائنس رهيو نہ ٿيو ۽ هڪ ئي وقت ڪيترائي محاذ کولي ويٺو ۽ هر هڪ سان مقابلي ڪرڻ لاءِ سندرو ٻڌي بيٺو-"**[14]

''حسام الدین نے کوشش کر کے پہلی اشاعت میں ہی ہر قسم کے موضوع پر تمام دلچسپ مواد مہیا کیا۔ادب اور تاریخ کے علاوہ سیاسی اہمیت کی اشیاء بھی دیں، مرحوم میں کچھ جذباتیت تھی، ان سے رہا نہ گیا اور ایک ہی وقت میں کئی محاذ شروع کر دیئے اور ہر ایک سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔''[15]

پیر علی محمد شاہ راشدی مزید لکھتے ہیں کہ:'' مرحوم (حسام الدین راشدی) اس سے دلچسپی رکھتا تھا کہ بمبئی سے علیحدہ ہونے کے بعد، جو سندھ کا نیا صوبہ بنایا جا رہا ہے، اس کے معاشرے کو مکمل طور پر نئے بنیادوں پر مضبوط بنایا جائے۔پہلے سے جو لوگ دقیانوسی ادارے تھے اور جن کی وجہ سے سندھی لوگوں میں جہالت پھیلی ہوئی تھی، ان سب کو ایک ہی لمحے میں ختم کیا جائے۔"اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت کی ساری کی طاقت ہماری دشمن بن گئیں، اور یہ افوہ پھیلانے لگیں کہ ہماری صحافت کا مقصد صرف توڑنا اور تباہ کرنا ہے۔حسام الدین دفتر ہر وقت میں ہوتا تھا اور لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتا تھا۔باہر کے لوگوں کے ساتھ میل جول نہیں تھا۔باہر کا کام میرا ذمہ تھا۔''[16]

بہر حال، ان محاذوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کہ تمام طاقتیں ان کے خلاف ہو گئیں اور انہوں نے اخبار اور اس کے مدیروں کے خلاف کیس درج کیا۔ یہ مقدمہ لگاتار تین سال، یعنی 1937 تک جاری رہا اور بلآخر عدالت نے مقدمہ خارج کر دیا۔

''ستارہ سندھ''، میں ابتدائی طور پر ہفتے میں دو مرتبہ شائع ہوا کرتا تھا، لیکن بعد میں 1936 اسے بعد میں ہفتہ وار کر دیا۔یہ اخبار بڑے سائز کے 6 صفحات پر مشتمل تھا۔اس اخبار کو اس وقت کے مشہور ادیبوں اور شاعروں کا تعاون حاصل تھا جس میں سیاست سمیت تعلیمی، تاریخی اور ادبی مواد بھی شائع ہوتا تھا۔

اس اخبار کی خصوصی شمارے 'بہار نمبر' اور 'خواتین نمبر' خاص اہمیت کے حمل ہیں۔[17] اس اخبار میں راشدی صاحب کے بھی بہت سے مضامین اور مقالات شائع ہوئے تھے، جن میں سے کچھ نام درج ذیل ہیں۔جو بعد میں ان کی کتاب'' باتیں گاؤں جانے کی'' میں شامل کی گئیں":

1. میاں محمد عارف صنعت—26 اگست 1934ء

2. مولانا محمد ھاشم اور مولانا عبدالواحد کی تصانیف، 20 ستمبر 1934ء
3. تاریخ عرب کے قدیم ماخذ، 2-9ء 16 دسمبر 1934ء
4. بیدل کی دل کا مالک 1935ء
5. سندھ کا ایک محسن گھرانہ- بہار 1936ء

31 مارچ، 1937 کو راشدی بھائیوں کے والد، سید حامد علی شاہ کی گاؤں بھمن میں رحلت ہوئی۔ اس افسوس ناک واقعے کی وجہ سے دونوں بھائی 'ستار سندھ' بند کر کے دوبارہ سکھر چھوڑ گاؤں آ گئے۔ کچھ عرصہ بعد، یہ لگتا ہے کہ بڑے بھائی، پیر علی محمد راشدی گاؤں بھمن چھوڑ کر کراچی چلے گئے، جہاں سیاست میں حصہ لینے لگے۔
جب کہ چھوٹے بھائی راشدی صاحب وہیں گاؤں میں ہی خاندانی پیشے زمینداری میں لگ گئے۔ اپنے کسانوں سے رویہ اچھا رہتا تھا۔ پیر علی محمد راشدی انہیں چھ ماہ میں کراچی بلوالیا۔

قرباني:

یہ اخبار 1932 میں شکار پور سے شایع ہوئی۔ اس کا ایڈیٹر، راچمند، ولد ویرو مل بیگراج تھا۔ 1945 میں، جب سائیں جی ایم سید کے مسلم لیگ کی سینئر قیادت سے تنازعہ ہوا، تو سید صاحب یہ اخبار خرید کر کراچی لائے۔ سائیں جی ایم سید لکھتے ہیں: " 1945 کے اختتام پر، جب ہمارے اختلافات مسلم لیگ کی اعلی قیادت سے ہوئے اور اخبار الوحید مختلف پروپیگنڈے کرنے لگا تو ہم نے شکار پور سے ریلیز ہونے والا "قربانی "اخبار اور پریس خرید کر کراچی میں لے آئے۔ اس کے پہلے ایڈیٹر مولوی خیر محمد کے نظامانی تھے، لیکن کچھ عرصے بعد دیکھا گیا کہ پارٹی کی یہ صحیح طریقے سے ترجمانی نہیں کر رہے، تو اخبار کی نظر داری کا ذمہ علی محمد شاہ نے لیا۔"[18]
'قربانی' اخبار میں، دونوں بھائی مل کر کام کرتے تھے۔ راشدی صاحب 1945 سے 1946 تک اس اخبار کے ایڈیٹر رہے۔ اس اخبار میں، کئی بار، میاں حسام الدین بھی بے نام مضمون اور اداریے لکھتے تھے۔
جب مسلم لیگ نے اپنے خاص وسائل کا استعمال کرتے ہوئے، مجھے سندھ اسمبلی کی انتخابات میں شکست دلوائی، تو اس وقت اس کا قربانی میں لکھا گیا ایڈیٹوریل کو ادبی شاہکار لکھا جائے تو درست ہوگا۔[19] 1947 میں، محمد ایوب کھڑو نے اپنی وزارت اعلیٰ کے دوران اس اخبار کو زبردستی بند کرادیا۔
پیر علی محمد راشدی صاحب کو برصغیر کی نہ صرف سیاست پر عبور تھا بلکہ وہ برصغیر کی ثقافت، تاریخ وتمدن اور عالمی حالات کی تغیر سے برصغیر پر پڑنے والے اثرات سے بھی وہ واقف تھے۔ اسی وجہ سے برصغیر کی تقسیم کے بعد وہ نہ صرف پاکستان کی سیاست و صحافت پر مکمل گرفت رکھتے تھے بلکہ وہ اپنے کالموں میں ان کمیوں اور کوتاہیوں کو بھی بیان کیا کرتے تھے جو کہ سیاست کے میدان میں ہوا کرتی تھیں۔
اس مضمون میں میری کوشش ہوگی کہ میں پیر علی محمد راشدی صاحب کے ان مضامین میں سے چیدہ چیدہ کا تعارف لکھوں جو جنگ اخبار کے

پرانے ذخیرے سے ملے ہیں۔اس سلسلے میں ہمدرد یونیورسٹی کی لائبریری میں بہت پرانا ذخیرہ ہے جس میں جس قدر مجھے ملا میں اس کا تعارف یہاں لکھ رہاہوں۔اگر کوئی محقق ان مقالہ جات پر کام کرنا چاہتا ہے وہ مجھ سے رابطہ کر سکتا ہے۔

درحقیقت پیر علی محمد راشدی صاحب نے جنگ اخبار میں کالم نگاری تین مختلف ناموں سے لکھ کر کی ہے:

1۔مکتوب مشرقِ بعید

2۔وغیرہ وغیرہ

3۔مشرق مغرب

اب مقالات کے تاریخ اور سن کے اعتبار سے تعارف کرائیں گے۔

ابتداء:

فلپائن کے صدر میکا پگال: ماہ مئی کے دوران مشرقِ بعید میں دو غیر معمولی واقعات رونما ہو چکے ہیں ان پر غور کرنے سے جمہوریت اور آمریت کے مابین افادیتی نتائج کے اعتبار سے جو فرق ہے وہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔[20]

اختتام:

مقابلتاً اگر کسی مرد آہن کی طبیعت مال ودولت پر آجائے تو روزِ قیامت سے پہلے کون اس بلا سے باز پرس کرنے کا مجاز ہوگا؟

جیتے جی وہ حساب دینے کا نہیں، ممکن ہے کہ وہ قبر میں بھی ڈرا دھمکا کر منکر نکیر تک کو ٹر کا دے۔ پس اللہ تعالیٰ کی عدالت سے نیچے ہے، کوئی ادارہ جو اس سے سوال جواب کر سکے۔

یہ مضمون میں نے ہمدرد یونیورسٹی کی لائبریری سے نقل کیا ہے اور اس کا فوٹو میری اپنی ای لائبریری میں موجود ہے۔

ابتداء:

پولیٹیکل سائنس اکانیٹی وشنل تھیوری اور پریکٹس کے طالب علم کو اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ دستور سازی کے میدان میں حضرتِ انسان نے کیا کیا کرتب دکھائے ہیں یا یہ دیکھنا ہے کہ کسی خاص آئینی نظامِ حکومت کے ماتحت ملکی کاروبار کس طرح چلتا ہے تو اس طالب علم کو مشرقِ بعید کی سیر کرنی چاہئے۔اس کام کے لئے دنیا کا یہ حصہ ایک لیبارٹری بن چکا ہے۔ہر قسم کے آئینی اور حکومتی نظام یہاں مروج ہیں۔[21]

اختتام:

خدا کرے کم چنگ پل کے اخراج سے کوریا کا معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے اور طالب علم خود صدر کے مستعفی ہونے پر زور نہ دیں، مگر یاد رہے کہ جھگڑے کی ابتداء غلط پبلسٹی سے ہوئی تھی۔

ابتداء:

یک نہ شد دو شد۔اب گولڈ واٹر امریکی صدر بھی تشریف لے آئے ہیں، روس میں اضطراب ہے، مغرب بعید میں حشر بر پا ہے، لندن ٹائمز

تک چلا اٹھا ہے، تنہا مشرقِ بعید والے مطمئن ہیں۔[22]

اختتام:

میری اپنی گزارش ہے کہ وقت نازک ہے۔ وقت سوچنے کا ہے، وقت تحمل و بردباری اور دانش مندی کے استعمال کا ہے۔ آنے والی لڑائی اس قسم کی نہیں ہوگی جس قسم کی دو لڑائیاں دنیا پہلے دیکھ چکی ہے۔ پہلی لڑائی کے موقع پر ہمارے بزرگ پلنگ پر بیٹھے ہوئے جنگ کی رفتار پر طبع آزمائی فرماتے رہتے تھے، دوسری جنگ کے دوران اس خاکسار کو محض اپنی موٹر کے پیٹرول کو نوں کی فکر دامن گیر رہی مگر اب کوئی جنگ چھڑ گئی تو سارے پچھلے قرض بمعہ سود ادا کرنے پڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

ابتداء:

ہانگ کانگ میں سردی شروع ہے۔ ایک مقامی چینی اخبار نے لکھا ہے کہ مقامی شوقینوں کے لئے کتے کا گوشت استعمال کرنے کا موسم آگیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ کتے اتنے دنوں سے گوشت کھا کھا کر موٹے ہو گئے تھے۔ اب ان کو حساب بھی دینا پڑے گا۔[23]

اختتام:

ایک سابق وزیر ہندوستان کا واقعہ لکھتے ہیں کہ پاکستان بننے کے بعد ایک دن یہ صاحب اپنے کچھ ہندوؤں کو بمبئی روانہ کرنے کی غرض سے جہاز کے ٹکٹ خرید کر راستہ میں ایک دوست کے ہاں آئے، میں بھی وہاں موجود تھا۔ انہوں نے ٹکٹ دکھائے تو میں نے مذاق میں یہ کہا کہ کاش یہ ٹکٹ تم اپنے لئے خریدے ہوتے مگر ہٹلر میں یہ عقل آئی کہاں؟ یہ الفاظ سنتے ہی وہ اسی وقت روانہ ہو گئے۔ مجھے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ انہوں نے میرے اس جملے کے کسی ضرورت سے زیادہ گہرے معنیٰ لئے یہ صبح اخبارات میں دیکھا تو وہ واقعی انہی ٹکٹوں پر پچھلے مسافر روانہ ہو گئے۔

ابتداء:

مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔ وہاں کے تازہ ترین سیاسی رجحانات کس قسم کے ہیں؟ مجیب الرحمٰن صاحب کے سات نکاتی سیاسی منشور کو کس قدر اہمیت حاصل ہے؟ کیا یہ واقعہ ہے کہ یہ منشور مشرقی پاکستان کے عوام کے حققی جذبات کی نشاندہی کر رہا ہے؟ زبان کا مسئلہ کس منزل پر ہے، اردو کس حال میں ہے؟ ڈھاکہ یونیورسٹی کیوں بند ہے؟ مقامی لیڈر صاحبان کیا سوچ رہے ہیں؟[24]

اختتام:

اصل سوالات کے جوابات کیا ہیں میں اپنی معلومات کے اعتبار سے اگلے ہفتے عرض کروں گا، اس کے علاوہ چند ایک اور ضروری چیزوں کے متعلق بھی اپنے ناچیز خیالات پیش کروں گا۔

نوٹ: یہ مقالہ اسٹیٹ بنک آف پاکستان، کراچی کی لائبریری سے لیا گیا ہے۔

ابتداء:

مشرقی پاکستان کے مسائل پر بحث کے دوران پچھلے ہفتے کی صبح میں نے اپنی طرف سے یہ خیالات عرض کئے تھے:

1۔ مشرقی پاکستان کو اقتصادی خیالات کے بارے میں جس قدر شکایات ہیں، وہ اس زمانے کی پیداوار ہیں جب مشرقی پاکستان کے اپنے نمائندوں کو پاکستان کے مرکز میں اقتدار اعلیٰ حاصل تھا۔

2۔ مجیب الرحمٰن کا منشور اس کی ظاہری اور لفظی ترکیب اور ترتیب سے قطع نظر فی الحقیقت مشرقی پاکستان کے ان لوگوں کے خیالات کی غمازی کر رہا ہے جن کو اس وقت دو فکریں لگی ہوئی تھی (1) مشرقی پاکستان کا دفاع (2) پارلیامانی نظام حکومت کی بحالی۔ ضمناً اب ان کی خواہش ہے کہ ایمر جنسی ختم ہونی چاہئے۔[25]

اختتام:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

مجھے تو افسوس ہے اس کا کہ انہوں نے بعض سیاسی اور آئینی مسائل کو بھی اپنے اس مجنونانہ فارمولے میں ضبط کر کے خواہ مخواہ اس کی اہمیت کم کر دی ہے اور پاکستان کے عوام کی توجہ ان سے ہٹا دی ہے۔

نوٹ: اس مضمون کی اور بھی قسطیں ہیں لیکن مجھے نہیں ملیں اگر کسی کو مل جائے تو بہتر ہے کہ مشرقی پاکستان کے کیا حالات تھے جن کی وجہ سے پاکستان کا لفظ ہٹا کر بنگلہ دیش بن گئے، کیا یہی حالات ہمارے پاکستان کے بعض علاقوں میں تو نہیں۔ یہ مضمون اسٹیٹ بنک آف پاکستان کراچی کی لائبریری سے حاصل کیا گیا۔

ابتداء:

آپ کو معلوم ہے کہ ان دنوں مشرق و مغرب دونوں کے حالات برے چل رہے ہیں، کہیں سے کوئی اچھی خبر نہیں مل رہی۔ ہر طرف یا تو مار دھاڑ مچی ہوئی ہے یا مار دھاڑ کے منصوبے بن رہے ہیں۔[26]

اختتام:

یاد رہے کہ دنیا کو آج انسانوں کی ضرورت ہے اور انسان بغیر علم انسان نہیں رہتے۔ ایا ران خوش قسمت ہے کہ اس کو ایسا حقیقت شناس قائد ملا ہے۔ مشرق پھولا نہیں سماتا کہ اس کے یہاں ایک اور چین کنگ میدان عمل میں آ رہا ہے؟ بس!

بریں مژدہ گر جان فشانم رواست۔

نوٹ: اس مضمون میں مشرق و مغرب میں مسلمانوں کی کمزوریوں اور ان کی کوتاہیوں کو بیان کر کے انہوں نے لکھا ہے کہ اصل مسئلہ قیادت کی کمی کا ہے نہ کہ وسائل۔ یہ مضمون ہمدرد یونیورسٹی کراچی کی لائبریری سے حاصل کیا گیا ہے۔

ابتداء:

مشرق و مغرب میں اس وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہے اور بہت کچھ اس کے بعد بھی ہو گا اس پر لکھا بھی گیا ہے مگر اس محبت میں مناسب ہے کہ گھر

کی باتیں کریں۔ اوّل خوش درویش عام کہاوت ہے کہ انسانوں کو سو کوس سے بھی اپنا گھر صاف نظر آتا ہے، باقی دنیا کتنی خوبصورت کیوں نہ مگر گھر پھر بھی گھر ہوتا ہے۔[27]

اختتام:

زیادہ سے زیادہ حکومت یہ کر سکتی ہے کہ بڑے چھروں کے کارتوس پر پابندی عائد کر دے اور بغیر پرمٹ کے کسی کو SGاور LE کے کارتوس دو کانوں پر سے نہ مل سکیں یہ پہلے بھی ایسے مواقع پر ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہو سکتا ہے۔

نوٹ: اس مضمون میں علی محمد راشدی صاحب ملک میں امن وامان کی صورتحال کو مد نظر رکھ کر حکومت سیاست دانوں اور عوام کو مشورہ دے رہے ہیں کہ کس طرح ممکن ہے امن کی صورتحال کو قابو میں لانا۔ ہمدرد یونیورسٹی، کراچی کی لائبریری سے لیا گیا ایک مضمون۔

ابتداء:

لاء اینڈ آرڈر یعنی جان اور مال کی سلامتی کا مسئلہ اس وقت تک مکمل طور پر حل نہیں ہو سکتا جب حکومت کے ساتھ ساتھ ملکی عوام میں بھی اس کے بارے میں صحیح شعور اور احساس پیدا نہیں ہوتا۔ یہ وہ تالی ہے جو ایک ہاتھ سے نہیں بجائی جاسکتی۔[28]

اختتام:

جب ترکی قبرص میں سنگین آزمائش سے دوچار تھا پاکستان نے ہمیشہ واضح طور پر ترکی کی حمایت کی مثلاً: 1954ء میں جب قبرص کا مسئلہ اقوام متحدہ میں زیرِ بحث تھا اس وقت پاکستان مندوب نے اس جزیرہ کے متعلق ترکی کے قانون اور تاریخی دعویٰ کی حمایت کی۔

نوٹ: اس مضمون میں راشدی صاحب نے امن عامہ کی صورتحال کو قابو میں لانے کے لئے کچھ تجاویز دینے کے بعد ترکی کے قومی دن کے موقع پر ترکی اور پاکستان کی عوام اور حکومت کے درمیان مناسبت کے لئے یہ مضمون لکھا۔ یہ مضمون ہمدرد یونیورسٹی، کراچی کی لائبریری میں جنگ اخبار میں موجود ہے۔

ابتداء:

گورنر مغربی پاکستان کے حکم پر جرائم پیشہ لوگوں، چوروں، ڈاکوؤں، غنڈوں کے خلاف چلائی ہوئی مہم بے حد ضروری اور وقت کے تقاضوں کے عین مطابق انتقامی اقدام ہے۔[29]

اختتام:

غندوں کا مسئلہ مستقل طور پر اس طرح حل ہو سکتا ہے اگر یہ طریقہ اختیار کیا جائے۔

1۔ غنڈہ گردی ناقابل ضمانت جرم ہو، یعنی Preventive Action کی جگہ Substantive Office کا درجہ دیا جائے۔

2۔ سزایابی کے بعد مشرقی پاکستان کے کسی جیل میں رکھا جائے۔ صوبہ بدری کا نفسیاتی اثر بہت گہرا ہو سکتا ہے۔

3۔ ان کے مقدمے سرسری طور پر چل کر فیصلے ہوں اور فیصلوں میں تاریخ نہ ہو۔

4۔ سزا یافتہ غنڈوں سے کھیتی باڑی کا کام لیا جائے۔

5۔ سزا کی میعاد ختم کرنے کے بعد بھی چند سال تک ان کو ضمانت کے تحت رکھا جائے۔

6۔ ان کے پاس ایک شناختی کارڈ رہے جس کی بنیاد پر وہ چل پھر سکیں اور جس تھانہ کی حدود میں جائیں وہاں شناختی کارڈ دکھا کر اس پر دستخط کروالیں، بغیر شناختی کارڈ ان کا چلنا پھرنا دشوار بنادینا چاہیئے۔ یہ سسٹم انڈونیشیا اور چند ایک اور ملک میں رائج ہے جس کی وجہ سے وہاں جرائم میں کافی کمی آئی ہے۔

7۔ سزا یافتہ غنڈوں کے مؤثر اور ان کی فہرستیں صوبہ کے ہر تھانہ میں موجود رہیں۔

نوٹ: یہ مضمون ہمدرد یونیورسٹی، کراچی کی لائبریری سے لیا گیا ہے۔

علی محمد راشدی کی طبیعت کچھ اس طرح تھی جو وہ مشاہدہ کیا کرتے تھے اس کو اپنے تک محدود نہیں کیا کرتے تھے بلکہ اس کو آگے عوام الناس تک پہنچانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ آج کل کے صحافی اور اینکر حضرات حکومت کی ہر پالیسی کے مخالف ہوتے نظر آتے ہیں کیونکہ ان کا مفاد حکومت سے ٹکراؤ اور اس کی پالیسیوں سے مخالفت کی صورت میں ہے۔

ابتداء:

لاء اینڈ آرڈر کے مضمون پر پچھلے ہفتہ چند معروضات پیش کر چکے ہیں، آج ہم مزید چند باتیں عرض کر رہے ہیں۔

اس وقت دو مسائل فوری طور پر طالب توجہ ہیں (1) شہروں پر چوروں اور ڈاکوؤں کی پرورش۔ (2) اندرون صوبہ شاہراہوں پر راہزنی کے واقعات (آئے دن لٹیارے ٹولیاں بنا کر لوٹ مار شروع کر دیتے ہیں)۔[30]

اختتام:

فرض کیجئے کہ پوزیشن یہ ہو کہ ہمارے صوبہ مغربی پاکستان میں لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے لائسنس پر رائفلیں لے لیں ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں ایسی رائفلیں ہیں جو بغیر لائسنس کے ہیں تو پھر حکومت کو کوئی طریقہ نکالنا ہوگا جس سے ان لاکھوں خطرناک اسلحہ کے استعمال پر کنٹرول رکھا جائے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے کہ اتنے لاکھ رائفل غیر فوجی آدمیوں کے پاس رہیں۔

نوٹ: یہ اخبار جنگ، اسٹیٹ بنک آف پاکستان کراچی کی لائبریری سے لیا گیا ہے۔

ابتداء:

آزادی کا تہوار سال سال بھی خیر وخوبی سے گزر گیا کئی ایک احباب نے اس موقعہ پر کال کی، ظفر مندیوں اور مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں اپنے خیالات وجذبات پیش کئے ہیں، میرا تعلق چونکہ ماضی سے رہا ہے لہٰذا میں ماضی کے ماجرے عرض کر سکتا ہوں۔[31]

ابتداء:

آزادی کا تہوار اس سال بھی خیر وخوبی سے گزر گیا کئی ایک احباب نے اس موقع پر کال کی، طفر مندیوں اور مستقبل کے منصوبوں کے بارے

میں اپنے خیالات وجذبات پیش کیے ہیں، میرا تعلق چونکہ ماضی سے رہاہے للٰذا میں ماضی کے ماجرے ہی عرض کر سکتاہوں۔[31]

اختتام:

یہ واقعات 1938ء سے پہلے کے ہیں۔ 1938ء سے کراچی میں مسلم لیگ کا پاکستانی دور شروع ہوااور اس دور میں بہت سے لوگوں نے بہت کام کیا مگر اس کی تفصیل کے لئے کسی اور فرصت کا انتظار کرنا پڑے گا۔ آج صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ کراچی بھی سجاہدوں کا مسکن رہ اہے، یہاں بھی مادہ حریت کے کچھ مست است بستے تھے، یہاں بھی سیاسی چہل پہل رہتی تھی۔

نوٹ: یہ مضمون درحقیقت علم تاریخ وسیاست کے طالب علموں کے لئے ہے جو کہ یہ ابھی تک جان نہ سکے ہیں کہ تحریکِ پاکستان سے پہلے سندھ کا برصغیر کی سیاست میں کیا حصہ تھااور برصغیر میں پاکستان بننے کے لئے جگہ بھی سندھ خصوصاً کراچی کے نوجوان نے دی۔ یہ مضمون ہمدرد یونیورسٹی، کراچی اور اسٹیٹ بنک کراچی کی لائبریری میں موجود ہے۔

ابتداء:

بعض لوگوں اور دوستوں سے گاہے بگاہے احکامات جاری ہوتے رہتے ہیں کہ میں بھی تحریکِ پاکستان کی تاریخ پر کچھ لکھوں، قائداعظم محمد علی جناح کے متعلق اگر معلومات ہو تو وہ بیان کروں، علمی مجلسوں اور ادبی مجلسوں میں شریک ہو کر تاریخ سیاست اور سوانح پر مقالے پڑھوں۔[32]

اختتام:

اگر اس کام کی سرانجامی میں مجبوراً کچھ تاخیر ہو جاتی ہے تو فکر کی بات نہیں تاریخی واقعات صحیح فوکس میں کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہی آتے ہیں۔

نوٹ: یہ مضمون جنگ اخبار، کراچی کے ذخیرہ میں سے جو کہ ہمدرد لائبریری کراچی میں موجود تھا وہاں سے ہے۔ جاننا چاہئے اس مضمون میں صرف انہوں نے ایک نقشہ کھینچا ہے کہ قائداعظم ودیگر تحریکِ آزادی کے رہنماہیں ان کی کس طرح تاریخ لکھی جاسکتی ہے۔

References

1. Rashdi Ali Muhammad, Pir Hussamuddin Marhoom Hussamudin kiyan banyoo, Mehran rashdi number 1986.
2. Dr. Aziz u Rehman Bughio, sindhi sahafat ji irtiqa ain tareekh: chappo awal, institute of sindiology, 1988, paij: 5.
3. Pir Ali Muhammad Rashdi, Hussamuddin Marhoom Hussamudin kiyan banyoo, (mazmoon) hawaloo janayal, paij: 8.
4. Ibid, paij: 10.
5. Ibid. paij: 8.
6. G.M Syed, Jinab guzariyam jin seen, juld: 2, paij: 340.
7. Dr. Anwar Figar Hakro, Shikarpur ji sahafati tareekh, paij: 69 ain 137.
8. Rasheed Bhatti, Hussamudin ji afsana nigari, Hilal Pakistan Magazine, September 1983.
9. Shikarpur ji sahafati tareekh, paij: 77.
10. Ibid.
11. Pir Ali Muhammad Rashdi, Uhee Denha Uhee Sheen, juld: 3, hawaloo dinal, paij: 53.
12. Syed Hussamudin Rashdi, Hoo Dothi Hoo Denha, chapoo awal, 1977, Sindhi Adabi Board Jamshoro, paij: 133.
13. Pir Ali Muhammad Rashdi, Hussamuddin Marhoom Hussamudin kiyan banyoo, (mazmoon)

hawaloo janayal, paij: 9.
14. Ibid, paij: 14.
15. Ibid, paij: 15.
16. Dr. Qureshi Hamid Ali Khanai, Sindhi Zaban ja Adabi Mahwar Risala (1855-1935), Ti-mahi Mehran, 1981/1, paij: 178.
17. Rashdi Shah, Ali Muhammad, Pir, "Sukkhar jaa akbhar navees", Ti-mahi Mehran, Sindhi Adabi Board, Jamshoro, 1961, paij: 66.
18. Tareekh Sukkur, Rahimdad Khan Molai Shedia, Sindhi Adabi Board, Jamshoro, 2005, paij: 239.
19. Shah, Miran Muhammad, Syed, "Sindh ji Alehdigi jee Tareekh", Al Waheed Sindh Azad Number, 1936, paij: 135.
20. Maktoob Mashriq e Bayeed: 6 June 1964, Jung Akbhar, Karachi.
21. Maktoob Mashriq e Bayeed: 13 June 1964.
22. Maktoob Mashriq e Bayeed: 1st August 1964.
23. Maktoob Mashriq e Bayeed: 19 December 1964.
24. Mashriq wa Maghrib: 9 April 1966.
25. Mashriq wa Maghrib: 16 April 1966.
26. Mashriq wa Maghrib: 3 September 1966.
27. Mashriq wa Maghrib: 1st October 1966.
28. Mashriq wa Maghrib: Pakistan or Turkey, 8 October 1966.
29. Mashriq wa Maghrib: 1st June 1968.
30. Mashriq wa Maghrib: 25 May 1968.
31. Mashriq wa Maghrib: 1st June 1968.
32. Mashriq wa Maghrib: 21 August 1968.